اُنتقادؔ کے لئے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے

انتقاد

اسلام پاکستان میں ـــ "پاکستان اور اسلام کے بنیادی مسائل کا خیال افروز جائزہ"

مصنف پروفیسر محمد عثمان ۔ ناشر مکتبۂ جدید ۔ لاہور

زیرِ نظر کتاب نہایت ہی سلیس، رواں اور دل کش اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ اس میں پاکستان کے اُس اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے، جسے عام طور پر "لبرل اسلام" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نقطۂ نظر ہمارے ہاں ابھی مخصوص حلقوں تک محدود ہے۔ اور بہت زیادہ زور رہا تو اُن لوگوں کا ہے، جو پہلی راہوں سے سرِ مُو اِدھر اُدھر ہٹنا بدعت و گمراہی سمجھتے ہیں اور اس کی شدید ترین مخالفت میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اور یا اس کے ردِ عمل کے طور پر ملک میں ایسے رجحانات اُبھر رہے ہیں، جو سرے سے ان بحثوں میں پڑنا بے کار سمجھتے ہیں اور سیاست و معیشت کے ساتھ عقائد و افکار کو بھی ماضی کے اِن بندھنوں سے کلیۃً آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ اب اگر اسلام کو پاکستان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ایک فعال اور موثر قوت کی حیثیت سے حال و مستقبل میں اپنا کردار ادا کرنا ہے، تو پروفیسر عثمان نے اس کتاب میں پاکستان اور اسلام کے بنیادی مسائل کے بارے میں جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے، اُس کے حسن و قبح کا جائزہ لینے اور اس راہ پر اور آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ موصوف کے نتائج بحث سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اگر ہمیں افراط و تفریط سے بچنا ہے، اور سرتاپا جمود و تقلید اور سرتاپا انکار کے درمیان کوئی اعتدال کی راہ نکالنا ہے، تو وہ یہی راہ ہے، جس کی طرح مصنف نے اس کتاب میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب میں بہت سے مسائل چھیڑے گئے ہیں۔ قرآن حکیم کس نوع کا نظام حکومت تجویز کرتا ہے۔ جہاد کا قرآنی تصور کیا ہے، عورتوں کے پردے کی کیا حدود ہوں، ہمیں اپنے لئے کون سا معاشی نظام وضع کرنا ہو گا اور ہم موجودہ نسلوں کو کس قسم کی تعلیم دیں، مصنف نے ان اُمور پر بحث کرنے کے بعد عہد حاضر کی بعض مشہور اسلامی

شخصیات جن کا تعلق اس برصغیر سے ہے، محاکمہ کیا ہے۔ اس ضمن میں سب سے دلچسپ محاکمہ سید ابوالاعلیٰ مودودی، خلیفہ عبدالحکیم اور غلام احمد پرویز کا ہے۔ مودودی صاحب کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:-

"........ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو میں ایک بڑا آدمی سمجھتا ہوں۔ اور اُن کی دو تین باتوں کا خاص طور سے قائل اور مداح ہوں۔ اوّل قرآن و حدیث میں اُن کی نظر، اور نظر سے زیادہ اُن کی رائے کا خلوص اور دیانت .... اُن کی جامعیت پر نگاہ رکھی جائے تو یہ کہنا محض اعترافِ حقیقت ہوگا کہ ہماری نشاۃِ ثانیہ (۱۸۵۷ء) کے بعد آنا اُن تک مفسرِ اسلام شاید کوئی اور نہیں۔"

اسی مضمون میں مصنف نے مولانا مودودی کو علماء کرام کے اُس تیسرے گروہ میں شمار کیا ہے، جنہوں نے "شاہانِ وقت سے بے نیاز رہ کر اور لباس اوقات ٹکمرے کر اپنے ذہن کی ضیا اور دل کی گرمی کو ہمیشہ خارج میں ایک نئی سوسائٹی، ایک نئے مسلم معاشرے کی صورت میں ڈھالنے کی جدوجہد کی ...."

مولانا ہی کے بارے میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:- "........ آپ اس بات کو تسلیم کریں گے کہ وہ جدید تمدن کے اکثر مسائل سے آگاہ اور نئے انسان کی بہت سی مشکلات سے واقف ہیں۔" اسی سے کچھ پہلے مصنف نے لکھا ہے:- "سید ابوالاعلیٰ مودودی میں جدید خیالات اور عہد حاضر کی تحریکات اور تقاضوں کا ایک فہم ملتا ہے۔"

یہ سب باتیں ایک مضمون میں ہیں، جس کا عنوان "سید ابوالاعلیٰ مودودی میری نظر میں" ہے۔ لیکن ایک دوسرے مضمون میں ایک جگہ خلیفہ عبدالحکیم، غلام احمد پرویز اور مولانا مودودی میں مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس میں جدید مسائل کے متعلق ہمارے ہاں جو تین بنیادی اندازہائے نظر پیدا ہو گئے ہیں، ان کا ذکر ہے۔ خود مصنف کے الفاظ میں "پہلا اندازِ نظر یہ ہے کہ جدید کو سرے سے تسلیم ہی نہ کیا جائے۔ زندگی کی اصل نہج آج بھی وہی ہے جو چودہ سو سال پہلے تھی .... جدید کو سمجھنے کی ہر کوشش مفاہمت کا پیش خیمہ ہے۔ اور ہمیں ہمارے موقف سے ہٹانے کا باعث ہوگی۔" اس سلسلے میں مصنف کا کہنا ہے:- "........ سید ابوالاعلیٰ مودودی پہلے اندازِ نظر سے تعلق رکھتے ہیں ...."

مضمون "پردے کے شرعی حدود" میں مصنف نے مولانا مودودی پر تنقید کی ہے۔ اب اس ضمن میں اُن کا یہ جملہ ملاحظہ ہو:-

"سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب "پردہ" میں اسلامی پردے کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے،"

میرے خیال میں سورۃ الاحزاب کی مفصلہ آیت کے ادھورے اور نامکمل مطالعہ پر مبنی ہے .... سید صاحب اس آیت کو اس کے سیاق و سباق سے کاٹ کر یہاں لائے ہیں .... وہ فقط آیت کے اُس حصے سے سروکار رکھتے ہیں، جو اُن کے خیال میں اُن کے نظریہ کی حمایت میں ہے ...... ظاہر ہے کہ یہ اندازِ مطالعہ اور طرزِ استدلال اگر کسی حقیقت کو بھی پیش کرے گا تو وہ اس کی ادھوری اور یک رُخی ترجمانی ہوگی ......"

ایک اور مضمون میں مصنف نے مولانا مودودی، غلام احمد پرویز اور خلیفہ عبدالحکیم کا جائزہ ان الفاظ میں لیا ہے: "........ ابوالاعلیٰ مودودی اس مدرسہ فکرِ اسلامی کی قیادت کر رہے ہیں، جو بدلے ہوئے حالات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ غلام احمد پرویز اس مکتبۂ خیال کو بڑھا رہے ہیں، جو صرف بدلے ہوئے حالات ہی کو درخورِ اعتنا سمجھتا ہے۔ اور خلیفہ عبدالحکیم اعتدال اور بصیرت اور اقتضا بینی کی ان روایات کے علمبردار تھے جن کو اولاً سرسید نے قائم کیا اور درمیان میں اقبالؒ نے نہایت بصیرت اور کامیابی کے ساتھ ترقی دی۔"

یہ لکھنے کے بعد موصوف نے مولانا مودودی پر یہ تبصرہ کیا ہے:۔

"سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یتیم پوتے کی وراثت سے لے کر خواتین کی سیاست میں شرکت تک قریب قریب ہر مسئلے اور ہر معاملے میں اسلام کے حُسنِ توازن، وسعتِ نظر اور صحیح انسانی آزادی کے پیمانے کو گھٹا چھلکا کر زندگی کی رفتار کو روکنے اور اُس کی راہوں میں سنگ ہائے گراں حائل کرنے کا کام پوری مستعدی، جوش اور قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔"

اب ایک مضمون میں تو مولانا مودودی کی جامعیت، جدید مسائل کا فہم رکھنے اور قرآن و حدیث میں اُن کی نظر اور نظر سے زیادہ اُن کی رائے کا خلوص اور دیانت کا بہت شاندار الفاظ میں اثبات ہے اور دوسرے مضامین میں عملاً اس کی نفی کی گئی ہے۔ اس طرح کی باتیں کتاب میں کھٹکتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جزواً جزواً چیزوں کو دیکھا ہے۔ ان کے بارے میں موصوف کا کوئی مجموعی تصور نہیں ہے۔ اگر مولانا ممدوح کے متعلق مصنف کی پہلی رائے صحیح ہے، تو یقیناً دوسری آراء مصنف کی مولانا کے ساتھ شدید بے انصافی پر مبنی ہیں۔

پر (۱۵) اور جہاد پر بڑی اہم بحث ہے۔ اسی طرح معاشی انصاف پر اسلامی نقطۂ نظر بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن مضمون "تصورِ تعلیم قرآن کی روشنی میں" ہمیں کہیں قرآن کی روشنی نظر نہیں آئی۔ الٹا تعلیم کا تصور بہت مبہم سا ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق پر جو مضمون ہے، ہمارے نزدیک اُسے اس شکل میں زیرِ نظر کتاب میں شائع کرنا موضوعِ کتاب سے زیادتی ہے۔ یوں یہ مضمون ادبی لحاظ سے ایک شہکار ہے۔ اور اس میں خوش ذوقی بھی ہے اور تجزیاتی دقتِ نظر بھی۔ اگر مصنف نے ڈاکٹر صاحب کی مشہور کتابوں کے مواد میں سے کچھ لے لیا ہوتا تو یہ مضمون کتاب کے اصل موضوع کے مناسب ہو جاتا۔ ڈاکٹر برق کی تین کتابیں دو قرآن، دو اسلام اور ایک اسلام ہمارے ہاں کی مذہبی فکر میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں، مصنف کو ان پر تبصرہ کرنا چاہیئے تھا۔

مضمون "سید احمد خاں۔ سیاسی بصیرت" میں اس بصیرت کا صرف ایک پہلو دکھایا گیا ہے۔ اس کا ایک اور پہلو بھی تھا، اُس کا بھی ذکر کرنا چاہیئے تھا۔ سر سید آئی سی ایس میں سرے سے "ہندوستانیوں" کی شرکت کے مخالف تھے۔ وہ اس کے بھی مخالف تھے کہ ہندوستان میں کسی قسم کی نمائندہ حکومت قائم ہو، اور تو اور انہیں یہ بھی ناگوار تھا کہ کنجڑوں، دھوبیوں اور بساطیوں کے بیٹے مقابلے کے امتحان دے کر افسر بن جائیں اور شرفاء پر حکومت کریں۔ سر سید کی اس "سیاسی بصیرت" کی پہلے پہلے مسٹر جناح (قائدِ اعظمؒ) نے بھرپور مخالفت کی اور پھر ۱۹۱۱ء کے بعد خود علی گڑھ کے نوجوان اس کے خلاف صف آرا ہوئے۔

کتاب کا سب سے پہلا مضمون "قرآنِ حکیم اور نظامِ حکومت" ہے۔ یہ موضوع چونکہ کافی مشکل ہے، اس لئے مصنف کو اس سے عہدہ برآ ہونے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ صاف اور سیدھا سوال یہ ہے کہ کیا قرآن حکیم میں کوئی نظامِ حکومت ہے یا نہیں؟ ۔ پروفیسر عثمان نے اس کا واضح جواب نہیں دیا۔ ایک طرف لکھا ہے "........ جدید معنوں میں قرآن کا اپنا کوئی (قطعی) معاشی یا سیاسی نظام نہیں ہے ...." دوسری طرف ارشاد ہوتا ہے "........ جدید اصطلاحی زبان میں وہ نہ سرمایہ دارانہ نظام ہے، نہ اشتمالی اور نہ اشتراکی۔ اسلامی نظام تو دراصل قرآنی احکام کی روح اور روحِ عصر کو تطبیق دینے سے تیار ہوتا ہے۔"

ظاہر ہے کوئی نظام تو روح نہیں ہوتا۔ پھر نظام تو ایک محسوس و معین چیز ہے۔ اور روح ایک غیر محسوس اور غیر معین۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ قرآن میں کوئی نظامِ حکومت نہیں۔ چنانچہ مصنف نے [illegible] کے حوالے سے بالواسطہ یہ بتا بھی دیا ہے کہ "مذہب و سیاست کی ایک گونہ دوئی کے نظریئے کی [illegible] کے اندر گنجائش ہے۔ گو سیکولر نظام اسلام کے منافی نہیں۔"

صحیح، لیکن مصنف نے اس مضمون میں یہ بات کہیں صاف طور سے نہیں کہی۔ صفحہ ۲۴ پر ہے۔

"....خود اسلام میں دین اور مملکت الگ الگ ہیں ...." لیکن کچھ بعد ارشاد ہوتا ہے :"....."
ن ایک اعتبار سے اسلام میں سیاست دین کی پابند ہے ......" اس سے کچھ آگے اقبال کا یہ اقتباس
ہے :" اسلام کے نظامِ تمدن میں مذہب سے سیاست کو الگ رکھنے کی گنجائش موجود ہے ....."
اقعہ یہ ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، یہ موضوع ہے ہی بڑا مشکل، لیکن مصنف کے اس مضمون سے
حل نہیں ہوئی، بلکہ اور مشکل ہو گئی ہے۔

آخر میں "حرفِ آغاز" میں "قرآنی تصورات کی توضیح و تفہیم" اور احادیث کے متعلق مصنف نے اپنا
سلوب بیان کیا ہے، اُس پر کچھ عرض کرنا ہے۔ موصوف کے نزدیک "احسن اور صحیح ترین طریق قرآن
ور اسلام دوستی کا یہ ہے کہ منشائے الٰہی کو کلام الٰہی ہی سے اخذ کیا جائے، اپنی یا دوسروں کی
کو کلام الٰہی میں پڑھنا میرے نزدیک اسلام دوستی نہیں، اسلام دشمنی ہے۔" احادیث میں سے معتبر
یث اور فقہ اسلامیہ کے وہ قدر دان ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے :-

"...... معتبر احادیث تک کا ایک بڑا حصہ اور بیشتر فقہ اپنی ترکیب کے لحاظ سے زمان و مکان
بند ہے اور ان دونوں سرچشمہ ہائے علم و بصیرت کا وہی حصہ زمان و مکان کی محدودیت سے آزاد ہے، جو
کی حکمت لازوال سے ہم آہنگی کی بدولت رنگِ ابدیت پاتا ہے ......"

ہم مانتے ہیں کہ قرآن حکمتِ ابدی کا سرچشمہ اور منبع ہے، لیکن اسے بیان تو زمان و مکان کی محدودیت
ں کیا گیا ہے۔ اب جیسے ہم قرآن کی اس محدودیتِ اظہار سے حکمتِ ابدی اخذ کرتے ہیں، کیا اسی طرح
احادیث سے اسے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ آخر قرآن میں اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا حکم موجود ہے۔ مالِ
ت کو تقسیم کرنے کی صریح ہدایات ہیں۔ حدود کا ذکر ہے۔ عثمان صاحب بحیثیت ایک "لبرل" مسلمان کے
احکام کی اصل حکمت پر زور دیں گے نہ کہ اُن کے ظواہر پر۔ اسی طرح معتبر احادیث کو اساس بنایا جا سکتا ہے۔

احادیث یا زیادہ معین الفاظ میں "سنت" جس میں سنتِ نبوی کے ساتھ خلافتِ راشدہ کے دور
فیصلے بھی شامل ہیں، اُس عہد کی عملی زندگی میں قرآنی احکام کی تطبیق کو پیش کرتی ہے، اور فقہ نے اسی
سلے کو آگے بڑھایا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ سب کچھ زمان و مکان کی حدود میں ہوا، ایسا ناگزیر تھا۔ ملت
پنے معنوی وجود کو صرف اسی طرح باقی رکھ سکتی ہے کہ اس سلسلے کو قائم رکھے۔ حکمتِ ابدی یا اس طرح
الفاظ بڑے ہی خوش کن ہیں، لیکن ان سے کام نہیں چل سکتا۔ حکمتِ ابدی کے کچھ معین مصادر چاہئیں

اور وہ جہاں تک اِس ملّت کا تعلق ہے، قرآن، سنّت اور فقہ ہے اپنے وسیع معنوں میں۔

مختصراً پروفیسر عثمان کی اس کتاب کی اشاعت ایک معرکہ آرا واقعہ ہوسکتا ہے، اگر ان مباحث کو جو اس میں ہیں، ہمارے اہلِ دانش اور آگے بڑھائیں۔ اس میں شک نہیں موصوف نے اس میں پہل کی ہے اور یہ ہر لحاظ سے اُن کا قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔

کتاب غیر مجلد ہے۔ آف سیٹ کی چھپائی ہے۔ قیمت پانچ روپے۔

سہ ماہی اُردو، شمارۂ خصوصی بیادِ غالبؔ

شائع کردہ انجمن ترقیِ اُردو۔
بابائے اُردو روڈ۔ کراچی I۔

گزشتہ فروری میں غالبؔ کی صد سالہ برسی بین الاقوامی سطح پر منائی گئی ہے۔ اس موقع پر انجمن ترقیِ اُردو نے برصغیر کے اس عظیم شاعر کو جو ادبی نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے وہ انجمن کے علمی و ادبی کارناموں میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس سلسلے میں ایک تو سہ ماہی اُردو کا غالب نمبر شائع ہوا ہے۔ دوسرے انجمن کے ماہنامۂ 'قومی زبان' کی جنوری سے مارچ تک کی اشاعتیں "بیادِ غالبؔ" کے لئے وقف ہیں۔ اس کے علاوہ غالبؔ سے متعلق پانچ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

سہ ماہی اُردو کے پیشِ نظر شمارۂ خصوصی میں غالبؔ پر جو مقالات ہیں، وہ سب کے سب اپنی جگہ منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ پہلا مقالہ "غالبؔ کی صحیح تاریخ پیدائش" سید صمد حسین رضوی ایگزیکٹو انجنیئر کا ہے۔ اس میں بحث اگرچہ غالبؔ کی تاریخ پیدائش کے تعین کی ہے، لیکن اس ضمن میں رضوی صاحب نے علم النجوم کے متعلق جو غالبؔ کے عہد میں رائج تھا، جو مواد دیا ہے۔ اور اس علم کی اصطلاحات کی جس طرح وضاحت کی ہے اس نے اس مقالے کا علمی درجہ بہت بلند کر دیا ہے۔ مصنف کو صحیح معنوں میں علم النجوم پر کامل عبور ہے، اور غالب کی تاریخ پیدائش کی تصحیح کرتے ہوئے اُنھوں نے اس علم پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ دیا ہے۔ اس ضمن میں موصوف نے غالبؔ کے زائچہ کا عکس بھی دیا ہے۔

غالبؔ کے فن و ادب پر بھی کئی وقیع مقالات ہیں، جن میں ڈاکٹر سبزواری، ڈاکٹر وزیر آغا، مولانا غلام رسول اور پروفیسر ممتاز حسین کے مقالات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس شمارہ میں غالبؔ اور اُس کا ماحول، غالبؔ